Part-1 

29-04-2017

دانشِ خورشید

(حصۂ اول)

مفتی منیب الرحمٰن

پاکستان کے اندر ریاست، ہماری قومی سلامتی کے اداروں اور عوام کے خلاف جو فساد برپا ہے، جانی اور مالی نقصان کی صورت میں ہم اُس کی بھاری قیمت ادا کر چکے ہیں، کر رہے ہیں اور یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ تا حال جاری و ساری ہے۔ اس کی شدت کبھی کم ہوتی ہے اور کبھی زیادہ، اسی طرح کبھی امن کا وقفہ قدرے طویل ہو جاتا ہے اور کبھی پے در پے واقعات ہونے لگتے ہیں، اس فساد کو ختم کرنے کے لیے پہلے آپریشن "ضربِ عضب" شروع کیا گیا اور اب آپریشن "ردُّ الفساد" جاری ہے۔ داخلی امن کے قیام کے لیے کراچی اور لاہور جیسے شہروں میں رینجرز کو اختیارات دیے گئے ہیں، یہ معمول کی صورتِ حال نہیں ہے۔

اس تناظر میں بار بار یہ سوال اٹھایا جا رہا تھا کہ ریاست اور عوام سے متصادم عناصر یہ کام مذہبی عنوان سے یا مذہبی تاویل کا سہارا لے کر کر رہے ہیں اور اس حوالے سے ثقہ علماء کا بیانیہ یا موقف سامنے نہیں آ رہا۔ دہشت گردی کے مختلف سانحات پر موقع بہ موقع سیاسی انداز کے مذمتی بیانات تو آ جاتے ہیں، لیکن ایک باقاعدہ مربوط دینی موقف سامنے نہیں آ رہا۔ سو قطعی موقف کا مطالبہ "جوابی بیانیے" کے عنوان سے کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ تمام مکاتبِ فکر کے علماء نے اس ذمے داری سے عہدہ برا ہونے کا فیصلہ کیا اور ایک متفقہ بیانیہ مرتب کر کے قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس بیانیے کا بنیادی مسودہ میں نے ترتیب دیا تھا، پھر اسے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے پڑھا اور بعض مفید مشورے دیے، حذف اور اضافہ بھی ہوا، پھر میں نے اسے حتمی شکل دی اور اُس کا مسودہ اتحادِ تنظیماتِ مدارس پاکستان کی رکن پانچوں تنظیمات کے ذمے داران کو ارسال کیا اور سب نے اُس کی توثیق کی۔

طے یہ ہوا تھا کہ وزیرِ اعظم پاکستان، وزیرِ داخلہ، وزیرِ مذہبی امور، چیف آف آرمی اسٹاف اور ہمارے حساس اداروں کے سربراہان کی موجودگی میں اِسے جاری کیا جائے گا، مگر اُس کی نوبت نہ آ سکی۔ چنانچہ میں نے اُسے روزنامہ دنیا میں شائع کیا اور بعض دیگر اخبارات و جرائد کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا پر بھی اُسے جاری کر دیا گیا، لاکھوں افراد نے پڑھ کر اس کی تحسین کی اور پذیرائی بخشی۔

لیکن علامہ غامدی کی فکر کے ترجمان جناب خورشید ندیم کو ہماری یہ کاوش یکسر پسند نہ آئی۔ انہوں نے اس پر منفی تبصرہ کیا، اِسے محض مذمتی بیان سے تعبیر کیا اور اپنی دانش کے جوہر بکھیرتے ہوئے نئے سوالات اٹھائے۔ ہم نے اپنے ملک کے تناظر میں اپنا موقف بیان کیا تھا اور عالمی سطح پر یا دیگر مسلم ممالک میں اس حوالے سے جو تحریکات اور باہمی آویزشیں جاری ہیں، اُن کو موضوعِ بحث نہیں بنایا

تاکہ لوگوں کے ذہن میں مسئلہ واضح ہو اور کنفیوژن پیدا نہ ہو۔ غامدی صاحب کی فکر کے حاملین کا ہمیشہ یہ مطالبہ رہا کہ فتوے جاری کرنے کا اختیار علماء کے پاس نہیں ہونا چاہیے، یہ ریاست کا کام ہے، ریاست یہ کام کہاں انجام دے رہی ہے، ہمیں اس کا علم نہیں ہے۔ البتہ خورشید ندیم صاحب نے اپنی جانب سے علماء پر کئی فتاویٰ صادر کردیے، وہ لکھتے ہیں:

''علماء بیانیے کو موضوع بناتے ہیں تو بالعموم تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہیں، وہ اس کے سیاق وسباق کو بالکل نظرانداز کردیتے ہیں۔ وہ جس بیانیے کا اپنے تئیں جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں، اُس کے بنیادی تصورات کو زیرِ بحث نہیں لاتے، وہ محض رویّوں کی مذمت کرتے ہیں۔ یہ رویّے جس دینی تعبیر کا حاصل ہے، وہ تعبیر ان کا موضوع نہیں بنتی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ اس بیانیے سے واقف ہی نہیں، تو اُن کی علمی ثقاہت کے بارے میں سوال اٹھتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ گریز دانستہ ہے، تو پھر علمی دیانت زیرِ بحث آئے گی''۔ خورشید ندیم نے ملک کے سرکردہ علماء کے بارے میں سوءِ ظن سے کام لیا اور مندرجہ ذیل فتاویٰ اُن پر لاگو کیے:

(۱) ''علماء نے ''تجاہلِ عارفانہ'' سے کام لیا ہے، یعنی حقائق سے صَرفِ نظر کیا ہے، اس کے معنی ہیں: ''جانتے بوجھتے انجان بن جانا'' اور عوامی زبان میں اِسے منافقت بھی کہہ سکتے ہیں، (۲) علماء نے سیاق وسباق کو نظرانداز کردیا ہے اور بنیادی محرّکات کو زیرِ بحث نہیں لائے، وہ محض رویوں کی مذمت کرتے ہیں، (۳) یا پھر علماء میں صورتِ حال کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں ہے اور یوں اُن کی فقہی ثقاہت مشتبہ ہے، (۴) اگر علماء نے ان کے پیش کردہ محرکات سے دانستہ گریز کیا ہے، تو پھر وہ بددیانت ہیں''۔

اگر ہم یہ لکھتے تو لبرل میڈیا ہاتھ دھوکر ہمارے پیچھے پڑجاتا، لیکن کسی نے جناب خورشید ندیم کے اس اندازِ بیان پر سرسری انداز میں بھی کلام نہیں کیا۔ خورشید ندیم صاحب کو اپنے بارے میں خوش فہمی ہے کہ دانش اُن سے شروع ہوتی ہے اور ان ہی پر ختم ہوتی ہے اور عالمی تناظر کو اُس کے حقیقی محرّکات واسباب سمیت صرف وہی جانتے ہیں۔ اس علمی تعلّی کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ ہمارا مسئلہ ''داعش یا القاعدہ'' نہیں ہے، داعش میں بھی اب لام کا اضافہ ہوچکا ہے، یعنی پہلے اس کا نام ''دولتِ اسلامیہ عراق وشام'' تھا، اب اس میں ''لیبیا'' کا لاحقہ بھی شامل ہوچکا ہے۔ یہ فکر عالمِ عرب میں تخلیق ہوئی اور وہیں کارفرما ہے، چونکہ اُن کے پاس وسائل ہیں، اس لیے وہ ہمارے خطّے، وسطی ایشیا اور امریکہ ویورپ سے فدائی یا ہم خیال افراد تیار کرکے اپنے ساتھ شامل کرلیتے ہیں۔ اسی طرح ''حزب التحریر'' اور ''المہاجرون'' ایسی تنظیمیں برطانیہ میں تخلیق ہوئیں اور اُن کی فکری آبیاری کرنے والے عرب علماء تھے، یہ الگ بات ہے کہ اس فکر سے یورپ میں مقیم پاکستانی نژاد اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان بھی متاثر ہوئے۔ ان میں سے ''حزب التحریر'' نظریاتی بنیاد پر لٹریچر کے ذریعے رُوبہ عمل ہے، اُن کی کسی دہشت گردانہ کاروائی کا ہمیں علم نہیں ہے، البتہ ''المہاجرون'' والے شدت پسند ہیں۔

سو ہم نے سادہ انداز میں اپنے خطّے کے تناظر میں بات کی تاکہ تمام متعلقہ لوگوں تک بات پہنچ جائے اور اس غلط فہمی کا ازالہ ہوجائے کہ ریاستِ پاکستان کے خلاف اس فساد کو مذہبی تائید وحمایت حاصل ہے یا مذہبی قوتیں اس کی پشت پناہ ہیں یا علماء اس کی نظریاتی آبیاری کررہے ہیں۔ اس لیے کہ ریاستِ پاکستان سے متصادم تحریکِ طالبان پاکستان کے بعض رہنماؤں کا کوئی نہ کوئی علامتی تعلق مسلکِ دیوبند کے علماء سے سمجھا جارہا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وزیرِ داخلہ چودھری نثار علی خان کی تحریک پر جب ان طبقات سے مذاکرات

 

شروع ہوئے، تو علمائے دیوبند نے ہی سہولت کاری کی ذمے داری قبول کی۔ یہ مذاکرات ناکام ہوئے اور انجام کار ان کا مقدر ناکامی ہی تھا۔ لہٰذا اب ضروری تھا کہ تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کے ساتھ ساتھ علمائے دیوبند کی توانا آواز بھی شامل ہو کہ ریاست اور عوام سے برسرِ پیکار عناصر کے پاس اس فکر کی اساس پر دہشت گردی کی کارروائیوں کا کوئی شرعی جواز باقی نہ رہے۔ ہمارے بیانیے میں یہ بات دو ٹوک انداز میں بیان کردی گئی ہے۔ یہ بھی صراحت کردی گئی ہے کہ اگر پاکستان کا کوئی دینی ادارہ ان کا پشتیبان ہو یا ان کے لیے جائے پناہ بنے یا ان کو نظریاتی تقویت دے، تو حکومت اس کے خلاف قانونی کارروائی کرسکتی ہے، ہم اس کا دفاع نہیں کریں گے۔

جناب خورشید ندیم نے علماء پر ایک اور الزام یہ لگایا کہ اُن کے نزدیک اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کے حقوق مساوی نہیں ہوتے۔ ان کالموں میں، میں ایک سے زائد مرتبہ اس دستاویز کا ترجمہ درج کرچکا ہوں جس کی رُو سے فتح بیت المقدس کے بعد امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہاں کے نصاریٰ کو امان عطا کی تھی، اُن کی عبادت گاہوں اور صلیبوں کو تحفظ دیا تھا، اُن کو اپنے مذہب کے مطابق عبادت کی آزادی دی تھی اور یہ اُس وقت ہوا جب اسلام اُس خطے کی دو سپر پاورز کو شکست دے کر وحدانی سپر پاور بن چکا تھا۔ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ ہماری قانونی وسیاسی اصطلاحات اور روزمرّہ محاورے میں لفظِ اقلیت کے استعمال کو ترک کردیا جائے اور تمام غیر مسلموں کو مساوی درجے کا پاکستانی تسلیم کیا جائے۔ ہمارا آئین اُن کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے، لیکن جناب خورشید ندیم کو اس پر بھی اطمینان نہیں ہے۔ کسی بھی ملک میں نادر واقعات کو اُس ملک کا عمومی رویہ گردانا زیادتی ہے، کیا حالیہ برسوں میں ہم نے نہیں دیکھا کہ ہندوستان میں محض گائے ذبح کرنے کے الزام میں ایک ہجوم ایک مسلمان کو ظالمانہ طریقے سے مار مار کر موت سے ہمکنار کررہا ہے۔ لیکن جس طرح ہمارے ملک میں ایسے کسی ناخوشگوار واقعے پر میڈیا اپنے ملک کی مکروہ تصویر زور شور سے دنیا کے سامنے پیش کررہا ہوتا ہے، کیا انڈیا کا میڈیا اپنے ملک کے خلاف اس شعار کو اپناتا ہے۔

جناب خورشید ندیم الزام لگاتے ہیں:

''اسلامی ریاست کے مسلم اور غیر مسلم شہری برابر نہیں ہیں۔ چونکہ اسلامی ریاست ایک نظریے کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے، اس لیے جو لوگ اس نظریے پر ایمان نہیں رکھتے، ریاست کے ساتھ ان کی وفاداری پوری طرح ثابت نہیں ہوتی، لہٰذا مسلم اور غیر مسلم کے شہری حقوق برابر نہیں ہوسکتے۔ اس فرق کے سبب ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو کلیدی منصب نہیں دیے جاسکتے''۔ پاکستان کی موجودہ دستوری پوزیشن یہ ہے کہ غیر مسلم صدرِ پاکستان اور وزیرِ اعظم پاکستان کے علاوہ کسی بھی منصب پر فائز ہوسکتا ہے، صرف ان دو مناصب کے حلف نامے میں اِقرارِ ختمِ نبوت کا عقیدہ شامل ہے، چنانچہ ماضی میں مسیحی مذہب کے حامل جسٹس (ر) اے آر کارنیلیس اور جسٹس (ر) رانا بھگوان داس چیف جسٹس آف پاکستان رہ چکے ہیں۔ اِکا دُکا واقعات تو اب یورپی ممالک اور امریکہ میں بھی ہورہے ہیں، لیکن اُن پر کوئی الزام نہیں لگاتا کہ وہ بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ، آزادیٔ مذہب اور اپنے سیکولرازم کے نظریے سے منحرف ہوگئے ہیں، سو: ''نزلہ برعضوِ ضعیف می ریزد''۔

(روزنامہ دنیا، 29 اپریل 2017ء)

 

دانشِ خورشید

(حصہ دوم)

مفتی منیب الرحمٰن

جناب خورشید ندیم لکھتے ہیں:

''جہاد کی علت کفر کا خاتمہ اور غلبۂ اسلام ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ جہاد کفر کے خاتمے اور اسلام کو دیگر ادیان پر غالب کرنے کے لیے کیا جاتا ہے، یہ فرضِ عین ہے، یعنی ہر مسلمان پر فرض ہے''۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاد اسلام کا ایک اہم فریضہ ہے، لیکن خورشید صاحب کا یہ کہنا کہ علماء نے اسے ہر مسلمان پر فرضِ عین قرار دیا ہے، درست نہیں ہے۔ فقہائے اسلام کے نزدیک بعض ناگزیر صورتوں میں جہاد فرضِ عین ہے، ہر صورت میں نہیں ہے: امام کاسانی لکھتے ہیں: ''اگر جہاد کے لیے ''نفیرِ عام'' ہو اور تمام مسلمانوں کو جہاد میں شرکت کے لیے کہا جائے، اُس وقت یہ فرضِ عین ہے، ورنہ فرضِ کفایہ ہے، (بدائع الصنائع، ج:7،ص:145)''۔ سورۂ توبہ اور انفال میں جہاد کے فرضِ عین ہونے کے بارے میں صریح آیات ہیں۔ جب دشمن اسلامی ریاست پر حملہ آور ہو جائے تو اس صورت میں جہاد فرضِ عین ہوگا اور اِقدامی جہاد، جو مجموعی طور پر مسلمانوں کے لیے فائدہ مند ہو، کی صورت میں یہ فرضِ کفایہ ہے، تفصیلات کتبِ فقہ میں موجود ہیں۔ موجودہ زمانے میں فرضِ عین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص پر اپنی اہلیت کے مطابق خدمات پیش کرنا فرض ہے، اندھا دھند میدان میں کود جانا جنگی حکمتِ عملی کے منافی ہے، اس میں مسلح افواج کی ترجیحات کے مطابق حصہ لینا ہوگا۔

عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ کے ابتدائی دور میں ریاستی ادارے منظّم نہیں تھے، اس لیے جب کسی جہادی مشن کے لیے ''نفیرِ عام'' ہوتا تو جنگ کے قابل ہر شخص حسبِ توفیق اپنی سواری، زادِ راہ اور سامانِ حرب کے ساتھ لشکر میں شامل ہوتا، صرف بوڑھے، عورتیں، بیمار اور بچے مستثنیٰ تھے۔ لیکن جب باقاعدہ مسلح افواج کا شعبہ قائم ہوگیا، تو اب ہر شخص پر عملاً جنگ میں شرکت کرنا نفع بخش نہیں رہا، کیونکہ جدید سامانِ حرب اور فنِ حرب کی مہارت ہر ایک کو حاصل نہیں ہے، اس کے لیے خصوصی تربیت لازمی ہے۔ البتہ جب مسلح افواج سرحدوں پر دشمن کے مقابلے میں مصروف ہو جائیں، تو شہری اداروں اور تنصیبات کی حفاظت کے لیے آج بھی ''سِول ڈیفنس'' کے ادارے موجود ہیں۔ افواج اور سامانِ حرب کی نقل وحمل کے لیے بعض اوقات سرکاری اور پرائیویٹ ٹرانسپورٹیشن کو بھی مسلح افواج اپنی تحویل میں لے لیتی ہیں، زمانۂ جنگ میں اُن کے لیے قانون میں گنجائش رکھی جاتی ہے۔ البتہ دشمن ممالک کے ساتھ جنگ کا فیصلہ کرنا حکومت کا کام ہے، کیونکہ اُسے اپنی اور دشمن کی امکانی حربی قوت کا اندازہ ہوتا ہے اور کسی بھی جنگ میں کودنے سے پہلے اُس کے عواقب پر بھی غور کیا جاتا ہے، اِلّا یہ کہ دشمن اچانک

 

جنگ مسلّط کردے، تو اس کا سامنا کرنے کے سوا کوئی متبادل آپشن باقی نہیں رہتا۔

جنابِ غامدی کے ترجمان سید منظور الحسن لکھتے ہیں:

''غامدی صاحب کے نزدیک مسلم تشخص اور پاکستانی تشخص نہ باہم مغائر ہیں اور نہ لازم وملزوم۔ ایک مسلمان، مسلمان ہوتے ہوئے جس طرح عرب، امریکی، ایرانی اور افغانی ہوسکتا ہے، اسی طرح پاکستانی بھی ہوسکتا ہے، لیکن پاکستانی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ لازماً مسلمان بھی ہو۔ پاکستان کے مسلمان مذہبی اعتبار سے تقسیمِ ہند سے پہلے بھی مسلمان تھے اور بعد میں بھی مسلمان رہے، تاہم قومی اعتبار سے وہ پہلے ہندوستانی اور پھر بعد میں پاکستانی ہوئے۔ غامدی صاحب کے موقف سے اس طرح کا تاثر قائم کرنا صحیح نہیں ہے کہ وہ تحریکِ پاکستان کے تناظر میں دوقومی نظریے کو درست نہیں سمجھتے، ایسا ہرگز نہیں ہے، وہ مذہبی تشخص کی بنیاد پر جداگانہ قومیت کے تصور اور اُس کے نتیجے میں علیحدہ وطن کے مطالبے کو بالکل جائز قرار دیتے ہیں۔ البتہ وہ اِسے ایک خالص سیاسی مطالبہ سمجھتے ہیں، جس کا دین وشریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے اسلام کا نعرہ لگایا گیا تھا، یہ بانیانِ پاکستان کی نیت پر حملہ ہے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ منظور صاحب کیا کہنا چاہتے ہیں، کس نے کہا ہے کہ ہر پاکستانی کے لیے مسلمان ہونا لازمی ہے اور کوئی غیر مسلم پاکستانی شہری نہیں ہوسکتا۔ لیکن جب وہ جداگانہ قومیت کی بنیاد پر تقسیمِ ہند کو جائز قرار دیتے ہیں، تو مذہب کی بنیاد پر قومیت کے اصول کو انہیں تسلیم کرنا ہوگا، مگر اس کے لیے وہ ذہنی طور پر آمادہ نہیں ہیں۔ یہ لوگ دوسروں سے تو ہر بات کی دلیل مانگتے ہیں، لیکن خود دلیل کے بغیر بات کرتے ہیں اور یہ خواہش رکھتے ہیں کہ دوسرے آنکھیں بند کر کے ان کے مقلد بن جائیں۔

منظور الحسن لکھتے ہیں:

''نظمِ اجتماعی سے متعلق یہ شریعت کے احکام اس تنبیہ وتہدید کے ساتھ دیے گئے ہیں کہ جو لوگ خدا کی کتاب کو مان کر اُس میں خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، قیامت کے دن وہ اُس کے حضور میں ظالم، فاسق اور کافر قرار پائیں گے''۔ یہ نظریہ کہ ظلم، فسق اور کفر کا حکم آخرت میں لگے گا، دنیا سے اِن احکام کا کوئی تعلق نہیں ہے، تو کیا دنیا میں اسلام اور کفر ایک ہیں، کفر کو کفر نہیں کہا جائے گا، یہ موقف آپ نے قرآن کی کس آیت کے تحت اختیار کیا ہے؟۔ قرآنِ مجید کفر وایمان کے درمیان حدِّ فاصل قائم کرنے کے لیے ہی تو آیا ہے، کئی مقامات پر قرآن کو ''الفرقان'' یعنی ''حق وباطل کے درمیان فرق کرنے والا'' کہا گیا ہے، تو کیا اس دنیا میں مسلمان حق وباطل کے حوالے سے اندھیرے میں رہیں گے اور آخرت میں جا کر یہ واضح ہوگا، یہ ایسی منطق ہے جو صرف ہمارے اِن دوستوں کو اِلقا ہوئی ہے۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

''غامدی صاحب کے نزدیک شرک، کفر اور ارتداد کے حوالے سے قرآن وحدیث کے احکام کا تعلق زمانۂ رسالت کے مشرکینِ عرب ویہود ونصاریٰ سے ہے، جن پر رسول اللہ ﷺ کے براہِ راست انکار کی پاداش میں عذابِ الٰہی نازل کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد کفر، شرک اور ارتداد کے مرتکبین اور دنیا کے باقی انسانوں سے اب ان احکام کا کوئی تعلق نہیں ہے''۔ یہ الحاد کو فروغ دینا اور نصوصِ قرآنی کو اپنی رائے سے معطّل کرنا ہے، اسی فکر کے زیرِ اثر بعض لوگ میڈیا پر سرِ عام کہتے ہیں کہ انسانی فلاح کے کام کرنے والے غیر مسلم جنت میں جائیں گے۔ قرآنِ مجید کے احکام کو کسی زمانے تک محدود کرنے اور مابعد ادوار کے لیے منسوخ یا مُعطّل کرنے کے اختیارات آپ کے پاس

کہاں سے آئے، قرآن سے دلیل پیش کیجیے۔آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کی فکر کے حاملین کا تناسب پاکستان کے مسلمانوں میں کتنا ہے اور آیا مسلمانوں کی غالب اکثریت جن علماء کو اپنا رہنما اور اپنے لیے حجت مانتی ہے، وہ آپ کے نزدیک کسی گنتی میں نہیں ہیں۔آپ نے سنتوں کی پہلے ستائیس اور پھر سترہ تک تحدید کی، یہ مسئلہ آپ نے کہاں سے اخذ کیا؟ آپ کو جمہور امت کے نزدیک سنت کی تعریف یقیناً معلوم ہوگی۔

منظور صاحب لکھتے ہیں:

''خلافت کے بارے میں غامدی صاحب کا موقف یہ ہے کہ یہ ایک سیاسی اصطلاح ہے، یہ نہ دینی اصطلاح ہے اور نہ مسلمان اس کے مکلف ہیں کہ وہ خلافت کے نام پر دنیا کے تمام مسلمانوں کی ایک حکومت قائم کرنے کی سعی کریں۔ان کے نزدیک دنیا بھر کے مسلمانوں کا کسی ایک ریاست یا ایک حکومت کے تحت جمع ہونا ایک اچھی خواہش ہو سکتی ہے اور اس کے لیے پر امن جدوجہد بھی جائز ہے، لیکن اس تمنا کو ایک دینی مطالبے کے طور پر پیش کرنا درست نہیں، وہ کہتے ہیں: ''جن ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہ اپنی ایک ریاست ہائے متحدہ قائم کر لیں، یہ ایک پسندیدہ خواہش ہو سکتی ہے، ہم اس کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی جدوجہد بھی کر سکتے ہیں، لیکن اس خیال کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ یہ اسلامی شریعت کا کوئی حکم ہے جس کی خلاف ورزی سے مسلمان گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ہرگز نہیں، نہ خلافت کوئی دینی اصطلاح ہے اور نہ عالمی سطح پر اس کا قیامِ اسلام کا کوئی حکم ہے، (مقامات، 197)''۔

غامدی صاحب شاید حدیث کو دین کی اساس نہیں سمجھتے، اس لیے حدیث میں بیان کردہ خلفاء کی اصطلاح اُن کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔نبوت کے بعد انسانیت کا بہترین طبقہ صحابہ کرام کا تھا، جو رسول اللہ ﷺ کے براہِ راست تربیت یافتہ تھے، انہوں نے اپنے نظامِ حکومت کا نام خلافت ہی رکھا تھا، ان حضرات کے نزدیک شاید وہ سمجھ نہ پائے ہوں کہ خلافت کوئی دینی اصطلاح نہیں ہے، جب تک اسلام کو غلبہ حاصل رہا، جمہور امت نے اِسی اصطلاح کو استعمال کیا۔مقامِ حیرت ہے کہ ریاست کی اصطلاح قبول ہے اور خلافت کی اصطلاح مردود ہے، صدر یا وزیرِ اعظم کی اصطلاح قبول ہے، لیکن خلیفہ کی اصطلاح نامقبول۔ ہم نے کب جدید اصطلاحات کو خلافِ اسلام قرار دیا ہے، لیکن عہدِ نبوت کے بعد جس اصطلاح سے مسلمان مانوس رہے، وہ خلافت ہی ہے اور جب آپ خود مانتے ہیں کہ جمہوری طریقے سے اِحیائے خلافت کے لیے جدوجہد جائز ہے، تو پھر پریشانی کس بات کی؟ چلیے! مسلمانوں کی ایک پسندیدہ خواہش کو دل پر پتھر رکھ کر برداشت کر لیجیے، آپ کا احسان ہوگا۔ یہی سمجھ لیجیے کہ خلافت کے عنوان سے مسلمانوں کی وحدت ایک جنونی تخیُّل ہے، بہت سے انسانی خواب اپنی تعبیر نہیں پاتے اور کبھی نعمتِ غیر مترقبہ کے طور پر ناقابلِ تصور خواہشات بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت سے پوری ہو جاتی ہیں۔خلافت کے نام پر فساد کی نہ تو ہم نے حمایت کی ہے، نہ اِسے درست سمجھتے ہیں اور نہ اس کو دین کا لازمی تقاضا سمجھتے ہیں، لہٰذا جمہورِ امت پر یہ تہمت جائز نہیں ہے۔

مسلم اکثریتی آبادی پر مشتمل ملک میں پر امن جمہوری جدوجہد کے ذریعے نفاذِ شریعت کا مطالبہ جمہوریت کے کس اصول کے تحت ناجائز ہے۔ حدود و قصاص کے قوانین اور اسلام کے دیگر احکام اپنی عملی تنفیذ کے لیے قوتِ نافذہ کا تقاضا کرتے ہیں، کیا اب انہیں تاقیامت معطل سمجھا جائے، اگر جواب نفی میں ہے، تو کیا مسلمان نفاذِ شریعت کے لیے پر امن جمہوری جدوجہد کے مکلف نہیں ہیں، فساد کے حق میں کوئی بھی نہیں ہے، کامیابی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

(روزنامہ دنیا، 06 مئی 2017ء)